دیوار

ــ ژاں پال سارتر
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی

انہوں نے ہمیں ایک بڑے سے سفید رنگ کے کمرے میں دھکیل دیا۔ میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ روشنی سے ان میں چکا چوند ہو رہی تھی۔ جب آنکھیں ذرا ٹھیک ہوئیں تو مجھے ایک میز نظر آئی۔ اس کے چاروں طرف چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ آدمی فوجی نہیں تھے۔ سب کے سب کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ دوسرے قیدیوں کو پیچھے کی طرف کھڑا کیا گیا تھا اور ان تک پہنچنے کے لیے ہمیں پورے کمرے میں سے گزرنا پڑا۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جنھیں میں جانتا تھا۔ باقی نہ جانے کون تھے۔ میرے سامنے جو دو قیدی تھے ان کے رنگ اُجلے اور سر گول تھے۔ ایک دوسرے سے بہت مشابہ۔ غالبًا یہ فرانسیسی تھے۔ ان میں جو چھوٹا تھا، بار بار گھبرا کر اپنا پاجامہ اوپر کو کھینچتا تھا۔

تین گھنٹے تک کارروائی ہوتی رہی۔ میں بے دم ہو رہا تھا اور میرا سر خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ یہ کمرہ خوب گرم تھا اور مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے ہم سردی سے کانپتے رہے تھے۔

قیدیوں کے نگراں ایک ایک کر کے قیدی کو میز کے آگے لاتے اور وہ چاروں آدمی ان کا نام اور کام پوچھتے۔ کام کم اور وقت زیادہ ضائع ہو رہا تھا۔ کبھی کچھ پوچھ لیا کبھی کچھ۔ ''کبھی تم نے کسی اسلحہ ساز کارخانے کو برباد کیا؟'' یا ''۹ تاریخ کی صبح کو تم کہاں

تھے اور کیا کر رہے تھے؟"

جواب یا تو وہ سنتے ہی نہیں تھے یا یہ ظاہر نہیں کرتے تھے کہ سن رہے ہیں۔ اک ذرا خاموش ہو کر سامنے تکتے اور پھر کچھ لکھنے لگتے۔ ٹام سے انہوں نے پوچھا۔ "تم نے بین الاقوامی دستے میں شرکت کی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" ٹام اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ تلاشی کے وقت اُس کی جیب سے کاغذات برآمد ہو چکے تھے۔ جوان سے اُنہوں نے کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ اس کا نام پکارنے کے بعد وہ دیر تک لکھتے رہے۔

جوان بولا۔ "وہ میرا بھائی جوز ہے جو انقلابی ہے۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ وہ یہاں اب نہیں ہے۔ میں کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا۔ مجھے سیاسیات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔" انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوان نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں کی سزا میں بھگتنا نہیں چاہتا۔"

اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ایک محافظ نے اُسے چپ کرا دیا۔ اب میری باری آئی۔

"تمہارا نام پابلو ابی امی ٹا ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

اس شخص نے کاغذات کو دیکھا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ "رامن گرس کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تم نے ۶/تاریخ سے ۱۹/تاریخ تک اُسے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔"

"نہیں۔"

پھر انہوں نے کچھ لکھا اور محافظ مجھے باہر لے گئے۔ گلیارے میں ٹام اور جوان دو محافظوں کے بیچ میں کھڑے تھے۔ ہم سب مل کر چل پڑے۔

ٹام نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟"

محافظ نے پوچھا۔ "کیا؟"

"یہ کوئی تحقیقات تھی یا مقدمہ؟"

محافظ نے کہا۔ "یہ مقدمہ تھا۔"

"ہمارا اب کیا ہوگا؟"

محافظ نے رکھائی سے جواب دیا۔"اپنی اپنی کوٹھری میں تمہیں تمہارا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔"

ہماری جو کوٹھری تھی وہ دراصل ایک اسپتال کا تہہ خانہ تھا۔ یہاں بڑی سردی تھی اور سرد ہوا کے جھونکے اس میں بہت آتے تھے۔ ساری رات ہم کانپتے رہے۔ دن کو بھی سردی کم نہ ہوئی۔ میں نے پچھلے پانچ دن ایک گرجا کے تہہ خانے میں گزارے تھے۔ یہ ایک طرح کا مجسمہ تھا، پرانے زمانے کا۔ وہاں قیدی بہت سارے تھے اور جگہ کم تھی۔ اس لیے جہاں جگہ ہوتی وہیں انہیں بند کر دیا جاتا تھا۔ مجھے اس میں قید ہونے کا غم نہیں تھا۔ سردی نے مجھ پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا مگر تنہائی نے مار لیا تھا۔ گلیارا لمبا اور اجیرن تھا۔ اس تہہ خانے میں ساتھی بھی تھے۔ جوان کو تو چپ لگ گئی تھی۔ وہ سہا ہوا تھا اور ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی جو اسے کچھ کہنا سننا آتا۔ مگر ٹام اچھا ساتھی تھا اور ہسپانوی زبان خوب بولتا تھا۔

تہہ خانے میں ایک بنچ تھی اور چار چٹائیاں۔ جب ہمیں یہاں واپس لایا گیا تو ہم خاموشی سے بیٹھ کر انتظار کرتے رہے۔

چند لمحے بعد ٹام بولا۔"ہم سب تو ختم ہوئے۔"

میں نے کہا۔"مجھے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ بچّے کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔"

ٹام بولا۔"اس کے خلاف تو کوئی بات ہے نہیں۔ بس یہی ہے کہ وہ ایک فوجی کا بھائی ہے۔"

میں نے جوان کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

ٹام نے پھر کہا۔"تمہیں معلوم ہے۔ سارا گوسا میں یہ کیا کر رہے ہیں؟ قیدیوں کو سڑکوں پر لٹا کر ان پر لاریاں چلاتے ہیں۔ یہ بات ایک مراقشی فراری نے بتائی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں گولہ بارود کی کفایت رہتی ہے۔"

مجھے ٹام کی یہ بات کچھ بُری لگی۔ ایسی بات کہنے کا کیا موقع تھا؟ میں نے جل کر کہا۔ ''مگر پٹرول کی بچت تو نہیں ہوتی۔''

ٹام نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ ''وہاں سڑکوں پر اس کام کی نگرانی کے لیے افسر منہ میں سگریٹ دبائے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہتے ہیں۔ تم سوچتے ہو گے کہ جو قیدی زندہ رہ جاتے ہیں، انہیں یہ افسر مار ڈالتے ہوں گے۔ نہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ زخمیوں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گھنٹوں وہ پڑے چیخا کرتے ہیں۔ مراقشی کہہ رہا تھا۔ ''جب میں نے پہلی دفعہ یہ بات دیکھی تو میری ہمت نے جواب دے دیا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر یہ حرکت وہ یہاں نہیں کریں گے۔ اگر گولہ بارود ہی کم ہو تو اور بات ہے۔''

تہہ خانے میں روشنی چار موکھوں میں سے آتی تھی اور بائیں طرف چھت میں ایک گول روشن دان تھا جس میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اس پر ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ یہ اصل میں کوئلہ اندر ڈالنے کی کھڑکی تھی۔ عین اس کھڑکی کے نیچے کوئلے کی خاک کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کوئلے کا مقصد اصل میں اسپتال کو گرم رکھنا تھا۔ مگر جب سے لڑائی چھڑی تھی مریض یہاں سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ کوئلہ یونہی پڑا رہ گیا۔ کھڑکی کھلی رہ گئی اور بارش کے ساتھ اندر پانی بھی آتا رہا اور کوئلہ بھیگتا رہا۔

ٹام نے کانپنا شروع کر دیا۔ بولا۔ ''یا اللہ! میں تو جما جا رہا ہوں۔ سردی نے پھر کھانا شروع کر دیا۔''

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی ورزشیں کرنے لگا۔ ہاتھ کے ہر جھکولے کے ساتھ سفید بالوں بھرے سینے پر سے اس کی قمیص کھل جاتی۔ پھر وہ چت لیٹ گیا اور ٹانگیں اونچی کر کے قینچی کی ورزش کرنے لگا۔ اس کا دھڑ کانپ رہا تھا۔ ٹام مضبوط آدمی تھا مگر موٹا بہت تھا۔ مجھے معاً ان گولیوں اور سنگینوں کا خیال آیا جو اس نرم گوشت کے ڈھیر میں جلد ہی داخل ہونے والی تھیں۔ اگر وہ دبلا ہوتا تو شاید مجھے اتنا شدید احساس نہ ہوتا۔

سردی سے میں جما تو نہیں تھا مگر نہ تو اپنے کندھے ہلا سکتا تھا اور نہ ہاتھ۔ رہ رہ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے اور میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ میرا کوٹ کہاں ہے؟ اور پھر یکا یک خیال آیا کہ انہوں نے ہمیں کوٹ دیا ہی کب تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ انہوں نے ہمارے کپڑے لے کر اپنے فوجیوں کے دے دیئے تھے۔ ہمارے پاس صرف اپنی قیصیں تھیں۔ یا وہ سوتی پاجامے جو مریضوں کو گرمیوں میں پہنائے جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ٹام اٹھ کر بیٹھ گیا اور میرے پاس آ کر ہانپنے لگا۔

''کچھ گرمی آئی؟''

''یا اللہ! کچھ بھی نہیں۔ سانس تک بے قابو ہو گیا۔''

شام کو کوئی آٹھ بجے ایک افسر آیا اور اس کے ساتھ دو اور آدمی تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ پہرہ دار سے اس نے پوچھا۔ ''ان تینوں کے کیا نام ہیں؟''

پہرہ دار نے کہا۔ ''استین باک، ابی ای ٹا اور میر بل۔''

افسر نے آنکھ سے چشمہ لگایا اور فہرست دیکھنے لگا۔

'استین باک، استین باک۔ یہ رہا، تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی ماردی جائے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے پھر فہرست دیکھنی شروع کر دی اور بولا۔ ''باقی دونوں کو بھی۔''

جوان نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا، مجھے نہیں۔''

افسر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟''

''جوان میر بل۔''

افسر نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تمہارا نام بھی ہے۔ تمہیں موت کی سزا ملی ہے۔''

جوان نے کہا۔ ''مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

افسر نے کندھے اُچکائے اور ٹام اور میری طرف پلٹ کر بولا۔ ''کیا تم باسک ہو؟''

''باسک کوئی نہیں ہے۔''

افسر کو تاؤ آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''یہاں تین باسک ہیں۔ ان کے پیچھے کہاں کہاں بھاگتا پھروں؟ تو ظاہر ہے کہ تمہیں پادری کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

ہم نے اسے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ بولا۔ ''ایک بلجین تھوڑی دیر میں آئے گا۔ اسے اجازت دے دی گئی ہے کہ رات تمہارے ساتھ گزارے۔'' افسر نے فوجی سلام مارا اور باہر چلا گیا۔

ٹام بولا۔ ''دیکھا، میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ نرم دل ہیں یہ لوگ۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، مگر بچے کے لیے بہت بُرا ہوا۔''

میں نے یہ بات از راہِ انصاف کہی تھی۔ بچے سے مجھے محبت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بہت سکڑا ہوا، نقش مڑے تڑے اور خوف و اذیت سے بدنما ہو گئے تھے۔ ابھی تین دن پہلے وہ بچہ ہی تھا اور بچوں ہی جیسی باتوں سے لبھایا کرتا تھا۔ مگر اب تو سترا بہترا نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ کمسن کبھی نہ دکھائی دے گا۔ چاہے اسے چھوڑ ہی کیوں نہ دیا جائے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے اس پر ترس آئے لیکن ترس کھانے سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ مجھے ترس کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اور کچھ نہ بولا۔ بس سفید پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گئے۔ وہ پھر بیٹھ گیا اور پھٹے پھٹے دیدوں سے زمین کو گھورنے لگا۔ ٹام سلیقے کا آدمی تھا۔ اس نے بچے کا بازو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو اس نے زور سے جھٹک دیا اور عجیب طرح کا منہ بنایا۔

میں نے چپکے سے کہا۔ ''رہنے دو اسے۔ دیکھتے نہیں وہ اب پھوٹنے ہی والا ہے۔''

ٹام نے بادلِ ناخواستہ علیحدگی اختیار کی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ بچے کو دلاسا دے۔ اس طرح اس کا اپنا بھی کچھ وقت گزر جاتا اور اپنی زبوں حالی پر غور کرنے سے بھی بچا رہتا۔ مگر مجھے اس سے کوفت ہو رہی تھی۔ میں نے کبھی مرنے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ کبھی ایسا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ مگر اب وقت آ پہنچا تھا اور اب کچھ اور کرنا بھی کیا تھا؟

ٹام نے بولنا شروع کر دیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''تم نے بھی کسی کو ٹھکانے لگایا؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے مجھے بتانا شروع کر دیا۔ ''جب سے اگست شروع ہوا ہے میں نے چھ آدمی مارے ہیں۔'' یہ اسے ٹھیک یاد نہیں رہا تھا کہ کس کس جگہ۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے خود کبھی اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ شاید بڑی اذیت ہوتی ہو۔ مجھے گولیوں کا خیال آیا اور اس جلتی ہوئی بوچھاڑ کا جو میرے جسم کو توڑ کر گزر جائے گی۔ یہ سب باتیں اصل سوال کے دائرے سے خارج تھیں۔ مجھے سکون سا تھا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس پہاڑ سی رات باقی تھی۔ ٹام نے بولنا بند کر دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ وہ بھی سفید پڑ گیا ہے اور بڑا بیزار دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے دِل میں کہا۔ ''شروع ہو گیا کام۔''

اب رات ہو چکی تھی اور سوراخوں سے جو روشنی آ رہی تھی کوئلے کے ڈھیر سے مل کر کالا چکتّا بنا رہی تھی۔ چھت کی کھڑکی میں سے مجھے ایک تارا بھی دکھائی دیا۔ رات صاف اور جمانے دینے والی ہوگی۔ دروازہ کھلا اور پہرے دار اندر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک اُجلے رنگ کا آدمی گلابی خاکی وردی پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے سلام کیا۔

وہ بولا ''میں ڈاکٹر ہوں۔ ان تکلیف دہ حالات میں مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ آپ کی اذیت کم کرنے میں مدد دوں۔'' اس کی آواز خوشگوار اور شائستہ تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟''

''میں ہر طرح آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ ان آخری ساعتوں کی اذیت کو آپ کے لیے کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

''آپ ہمارے پاس کیوں آئے ہیں؟ بے شمار اور آدمی پڑے ہیں — ہسپتال ان سے پٹا پڑا ہے۔''

اس نے بے سوچے سمجھے جواب دیا۔ ''انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔'' پھر جلدی سے کہنے لگا۔ ''اچھا تم سگریٹ پینا چاہتے ہو؟ میرے پاس سگریٹ ہیں بلکہ سگار بھی ہیں۔''

اس نے ہمیں انگریزی سگریٹ دیے اور سگار بھی مگر ہم نے لینے سے انکار

کر دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔
میں نے اس سے کہا۔ "آپ یہاں ترس کھا کر تو آئے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں آپ کو جانتا بھی ہوں۔ جس دن میں گرفتار ہوا بارکوں کے آگے صحن میں آپ کو میں نے فاشسٹوں کے ساتھ دیکھا تھا۔" میں ابھی بولے جا رہا تھا کہ ایکا ایکی کچھ ایسی بات ہوئی کہ جس نے مجھے متعجب کر دیا۔ اس ڈاکٹر کی موجودگی سے میری دلچسپی ایک دم ختم ہو گئی۔ بالعموم جب میں کسی کے سر ہو جاتا ہوں تو پھر مشکل ہی سے اُس کا پیچھا چھوڑتا ہوں۔ بہر حال اس وقت بات کرنے کی خواہش بالکل معدوم ہو چکی تھی۔ میں نے کندھوں کو اُچکا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد پھر اُدھر دیکھا۔ ڈاکٹر میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہرہ دار ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ دبلا، پیڈرو اپنے انگوٹھوں کو گھما رہا تھا۔ دوسرا پہرے دار بار بار اپنے سر کو جھٹکا دیتا تھا کہ کہیں نیند نہ آ جائے۔
پیڈرو نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کیا آپ کے لیے روشنی لاؤں؟"
اس نے سر ہلا دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ نرا کاٹھ کا اُلو ہے۔ لیکن بدفطرت نہیں ہے۔ اس کی اُبلی ہوئی نیلی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی برائی کرتا ہے محض عقل کی کمی کی وجہ سے کرتا ہے۔ پیڈرو باہر گیا اور ایک تیل کا لیمپ لیے واپس آیا۔ لیمپ اس نے بنچ کے سرے پر رکھ دیا۔ روشنی تو وہ کچھ دیتا نہ تھا۔ مگر نہ ہونے سے بہتر تھا۔ کل ساری رات ہم اندھیرے ہی میں رہے تھے۔
میں کچھ دیر تک چھت میں روشنی کے اس حلقے کو دیکھتا رہا جو لیمپ کی چمنی نے بنایا تھا۔ مجھے بڑا لطف آیا۔ پھر یکا یک میں چونک پڑا۔ روشنی کا حلقہ غائب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مجھ پر ہزاروں من وزن رکھا ہوا ہے اور میں کچلا چلا جا رہا تھا۔ یہ موت کا خوف نہیں تھا، دہشت بھی نہیں۔ اس کا کوئی نام ہی نہیں تھا۔ گال جل رہے تھے اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔
میں نے اپنے آپ کو بدقت جنبش دی اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

ٹام اپنے دونوں ہاتھوں میں سر چھپائے ہوئے تھا۔ مجھے صرف اس کی سفید موٹی گدی دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹا جوان زیادہ بدحال تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ڈاکٹر اس کے پاس گیا اور اسے تسلی دینے کے لیے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

مگر اس کی آنکھیں ویسی ہی سرد رہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بلجین کا ہاتھ آہستہ آہستہ جوان کے کندھے پر سے پھسل کر بانہہ پر آیا اور پھر کلائی پر پہنچا۔ جوان نے کوئی توجہ نہ کی اور چپکا ہی رہا۔ جلدی سے ڈاکٹر نے تین انگلیاں اس کی کلائی پر جمائیں۔ پھر ذرا سا پیچھے ہٹا تاکہ میری طرف اس کی پیٹھ ہو جائے۔ لیکن میں نے آگے جھک کر دیکھا کہ اس نے جیب میں سے گھڑی نکال کر دیکھی اور پھر بچے کی کلائی کو چھوڑ دیا۔

بے جان ہاتھ چھوڑ کر وہ پھر دیوار سے جا لگا۔ پھر جیسے اسے کوئی بڑی ضروری بات ایکا ایکی یاد آ گئی ہو۔ اس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور اس میں کچھ لکھ لیا۔

مجھے بڑا غصہ آیا۔ حرام زادہ! اگر میری نبض دیکھنے آیا تو ایسا گھونسہ رسید کروں گا کہ یاد رکھے گا۔

وہ میرے نزدیک آیا تو نہیں مگر مجھے محسوس ہوتا رہا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں نے نظریں اٹھا کر سیدھی اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

غیر انسانی سی آواز میں اُس نے کہا۔ ''تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟''

اُسے سردی لگ رہی تھی اور اس کا رنگ نیلا ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں مجھے سردی نہیں لگ رہی۔''

اس نے میری طرف دیکھنا بند نہیں کیا۔ میں جلد ہی سمجھ گیا اور میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میں پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس تہہ خانے میں، اس کڑکتے جاڑے میں، برفیلی ہواؤں کے جھونکوں میں، مجھے پسینہ آ رہا تھا! میں نے سر کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں۔ پسینے سے بال گیلے ہو رہے تھے۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ میری قمیض بھیگ کر جسم سے چپک گئی ہے۔ کم از کم ایک گھنٹے سے پسینہ نچڑ رہا تھا اور مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی لیکن بلجین جانور نے خوب تاڑ لیا تھا۔ اس نے میرے گالوں پر قطرے

لڑھکتے دیکھ لیے تھے اور سوچتا ہوگا کہ یہ تو انتہائی خوف کی علامت ہے اور اسے خود سردی لگ رہی تھی جو صحت اور تندرستی کی علامت ہے۔ یہ سوچ کر ڈاکٹر کو بڑا ناز اور فخر محسوس ہوا ہوگا۔ جی میں آئی کہ اٹھ کر اس کا منہ توڑ دوں۔ مگر میں نے اس ارادے سے ابھی حرکت بھی نہیں کی تھی کہ میری خفت اور غصہ دونوں غائب ہو گئے۔ میں بینچ پر بے تو جہی سے پھر بیٹھ گیا اور اپنی گردن پر رومال سے پسینہ پوچھنے لگا۔ کیونکہ پسینہ اب بالوں میں بہہ بہہ کر گدی پر آرہا تھا اور بڑا گھناؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پونچھنا بند کر دیا۔ کیونکہ بیکار ثابت ہو رہا تھا۔ میرے کولھوں پر بھی پسینہ بہہ رہا تھا اور پاجامہ بینچ سے چپک رہا تھا۔

کم عمر جواُن ایک دم سے بولا۔ ''کیا تم ڈاکٹر ہو؟''

بلجین نے کہا۔ ''ہاں۔''

''کیا بہت...... بہت دیر تک تکلیف ہوتی ہے؟''

بلجین نے بڑی شفقت سے پوچھا۔ ''کب......؟ نہیں، جلدی ہی ختم ہو جاتی ہے۔''

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی بیمار کو دلا سادے رہا ہو۔

''مگر مجھے...... مجھے کسی نے بتایا تھا...... بعض دفعہ باڑھ دو دفعہ مارنی پڑتی ہے۔''

بلجین نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ''کبھی کبھی۔ ایسا ہو جاتا ہے بعض دفعہ کہ پہلی باڑھ میں سارے اعضائے رئیسہ بچ جائیں اور آدمی نہ مرے۔''

جوان نے کہا۔ ''تو وہ اپنی بندوقیں دوبارہ بھرتے ہوں گے اور پھر نشانہ لگاتے ہوں گے؟'' ایک لمحہ سوچ کر خشک آواز میں پھر بولا۔ ''اس میں تو کچھ دیر لگتی ہوگی۔''

اسے تکلیف کا بے حد خوف تھا اور لے دے کر یہی خیال بار بار اسے ستا رہا تھا۔ یہ احساس محض اس کے بچپن کی وجہ سے تھا۔ مجھے اس کا زیادہ خیال نہیں تھا اور یہ کوئی خوف کی وجہ نہیں تھی کہ مجھے اس قدر پسینہ آرہا تھا۔

میں اُٹھا اور کوئلے کی خاک کے ڈھیر تک چلا گیا۔ ٹام چونکا اور اس نے مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ میرا جوتا چرچراتا تھا، اس سے اسے طیش آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میرا چہرہ بھی ایسا ہی خوف زدہ تو نہیں ہو رہا جیسا کہ ٹام کا؟ میں نے دیکھا کہ

اس کے بھی پسینے چھوٹ رہے تھے۔ آسمان بالکل صاف پڑا تھا۔ اس کونے میں روشنی بالکل نہیں تھی۔ ذرا سر اوپر کو اٹھایا اور سات ستاروں کا جھمکا دکھائی دیا۔ لیکن یہ اب ویسا نہیں دکھائی دیتا تھا اور ہر گھڑی بھولی بسری باتیں یاد آتی رہتی تھیں۔ جب صبح ہوئی اور آسمان نیلا اور سخت نظر آنے لگا تو مجھے اٹلانتک کے ساحل یاد آئے۔ دوپہر کو میں نے سورج دیکھا اور مجھے سیول کا ایک میکدہ یاد آیا جہاں میں نے "مانزا نیلا" پی اور زیتون کے پھل کھائے تھے۔ تیسرے پہر کو میں گہرے سائے میں تھا اور مجھے اُن اندھیرے سایوں کا خیال آیا جو روم کے اکھاڑوں پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ آدھے تو اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں اور آدھے دھوپ میں جگمگاتے رہتے ہیں۔ ساری دُنیا کو اس طرح آسمان میں منعکس دیکھنا خاصا تکلیف دہ ثابت ہوا۔ مگر اب میں جتنا بھی چاہوں، آسمان کو تکتا رہوں۔ میرے لیے آسمان کے کوئی معنی نہیں رہے تھے۔ اس حالت میں ہی آسمان بہتر تھا۔ میں جا کر ٹام کے قریب بیٹھ گیا ...... تھوڑا سا وقت اور گزر گیا۔

ٹام نے نیچی آواز میں بولنا شروع کیا۔ اسے ہمیشہ ہی بولنا پڑتا تھا۔ ورنہ اس کے خیالات تمام گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ میں سمجھا کہ مجھ سے کہہ رہا ہے۔ مگر وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔ کیوں کہ میرا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور پسینے بہہ رہے تھے۔ ہم سب ایک جیسے تھے اور چغلی کھانے میں آئینہ سے بھی بدتر تھے۔ اس نے بلجین کی طرف دیکھا، یہی تو ایک شخص زندہ تھا۔

"کیا تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔"

میں نے بھی چپکے چپکے بولنا شروع کر دیا۔ پھر بلجین کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہوگا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

ٹام کے پاس سے ایک عجیب طرح کی بو آرہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری قوتِ شامہ اتنی تیز کبھی بھی نہیں تھی جتنی کہ اس وقت۔ میں نے نفرت سے ناک چڑھائی۔

''تمہیں جلدی ہی معلوم ہو جائے گا۔''
ٹام نے ضدی پنے سے کہا۔''کچھ صاف سمجھ میں نہیں آتا۔میں آسانی سے بہادر بن سکتا ہوں مگر مجھے آخر معلوم تو ہو! سنو، وہ ہمیں احاطے میں لے جائیں گے۔ چلو ٹھیک ہے۔وہ لوگ ہمارے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ کتنے ہوں گے وہ؟''
''مجھے نہیں معلوم۔ پانچ یا آٹھ ہوں گے۔ زیادہ نہیں ہوں گے۔''
''چلو ٹھیک ہے۔ آٹھ ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا۔''نشانہ لو۔'' اور میں دیکھوں گا کہ آٹھ رائفلیں میری طرف اٹھ گئیں۔ سوچتا ہوں اس وقت جی یہی چاہے گا کہ دیوار پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میں اپنی پوری طاقت سے دیوار میں سما جانے کی کوشش کروں گا اور دیوار ایک کابوس کی طرح مجھے بے بس کر دے گی۔ یہ سب کچھ تو میرے تصور میں آتا ہے۔ کاش تم جان سکو کہ یہ سب باتیں کس آسانی سے میرے تصور میں آجاتی ہیں۔''
میں نے کہا۔''بس بھائی بس۔ تصور ہمارے پاس بھی ہے۔''
''بڑی سخت تکلیف ہوتی ہوگی۔ معلوم ہے تمہیں؟ شکل وصورت بگاڑنے کے لیے وہ آنکھوں اور منہ کا نشانہ لیتے ہیں۔''
مجھے زخموں کی موجودگی ابھی سے معلوم ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے سے میرے سر اور گردن میں درد ہو رہا تھا۔ سچ مچ کا درد نہیں۔ اس سے بھی بدتر۔ ایسا درد جس کو میں اگلے دن بھی محسوس کرتا رہا۔ اور اس کے بعد؟''
میں خوب سمجھ رہا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے، مگر میں ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔ رہا درد کا سوال تو میرے جسم میں جگہ جگہ درد تھا، جیسے چھوٹے چھوٹے کئی زخموں کا ڈھیر لگا ہوا ہو۔ اس کا کوئی مداوا میرے پاس نہیں تھا۔ لیکن ٹام کی طرح میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔
میں نے بگڑ کر کہا۔''اس کے بعد لالہ و گل اُگیں گے۔''
اُس نے پھر آپ ہی آپ بولنا شروع کر دیا۔ اس کی نظریں بلجین پر ہی جمی

ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا کہ سن ہی نہیں رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کرنے آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات جس کا ہمیں خیال بھی نہیں ہوگا اس کی دلچسپی کا باعث بن جائے گی۔ وہ ہمارے جسموں کو دیکھنے آیا تھا۔ ان جسموں کو جو زندہ عذاب میں مبتلا تھے۔

ٹام نے کہا۔ ''یہ سب ایک کابوس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی بات کو سوچوں، احساس ہوتا ہے کہ میں نے اسے سوچ سمجھ لیا ہے اور اس کی حقیقت واضح ہوگئی ہے اور اتنے ہی میں وہ گرفت سے نکل جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا بعد میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کیا معنیٰ ہیں۔ کبھی کبھی وہ لمحے بھی آجاتے ہیں جب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کی تہہ کو تب پہنچا کہ اب پہنچا...... مگر وہ اتنے ہی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں نے پھر تکلیف اور گولیوں اور دھماکوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مادہ پرست ہوں۔ میں دیوانہ نہیں ہونے کا۔ مگر کوئی کل بگڑی ہوئی ضرور ہے۔ میں اپنی لاش کو دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ مگر یہ میں ہوں جو دیکھتا ہوں، خود اپنی آنکھوں سے۔ مجھے یہ سوچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ سوچنے کی کہ میں کوئی چیز بھی پھر نہیں دیکھ سکوں گا۔ کوئی بات پھر نہیں سن سکوں گا۔ لیکن دُنیا کا کارخانہ دوسروں کے لیے اسی طرح چلتا رہے گا۔ کسی کو اس ڈھنگ سے نہیں بتایا گیا کہ وہ اس طرح سوچے پابلو۔ تم میرا یقین کرو۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ساری ساری رات جاگ کر، کسی چیز کے انتظار میں۔ مگر وہ چیز اس کی طرح نہیں تھی۔ اس نے تو ہماری قوت ہی سلب کر لی پابلو اور ہم اپنے آپ کو تیار بھی نہیں کر سکے۔''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''میں تمہارے لیے کسی پادری کو بلوا دوں تاکہ تم اپنے گناہوں کا اقرار کر کے پاک ہو جاؤ۔''

اس نے مجھے جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ولیوں کی طرح بے رنگ آواز میں بار بار میرا نام لینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا کچھ زیادہ خیال نہیں کیا۔ بالعموم سارے آئرش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ موہوم سا خیال تھا کہ اس کے پاس سے پیشاب کا بھبکا آ رہا ہے۔ حقیقت میں مجھے ٹام کے ساتھ کچھ زیادہ ہمدردی نہیں تھی اور

ہمدردی ہونے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی، کیونکہ ہم دونوں کو ایک ساتھ مرنا تھا اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی نوعیت دوسری ہے۔ مثلاً رامن گرس کے ساتھ۔ مگر ٹام اور جوان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میں اکیلا تھا۔ میں تنہائی کو ترجیح بھی دیتا تھا۔ رامن گرس کے ساتھ میں نرمی سے پیش آتا، لیکن اس وقت میں نہایت سنگ دل ہو رہا تھا اور سنگ دل ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ بے سوچے سمجھے بڑبڑاتا رہا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس لیے بولے جا رہا تھا کہ سوچنے سے بچا رہے۔ فطری طور پر مجھے اس سے اتفاق تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہی میں بھی کہہ سکتا تھا۔ یوں مرنا فطری امر نہیں تھا، مگر چونکہ مجھے اب مرنا تھا۔ اس لیے کوئی چیز بھی مجھے فطری نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ کوئلوں کا ڈھیر، بنچ، پیڈرو کا گندہ چہرہ۔ مجھے صرف اس بات سے چڑ ہو رہی تھی کہ مجھے بھی وہی سوچنا پڑ رہا تھا جو ٹام سوچ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ رات بھر، ہر پانچ منٹ بعد ہم ایک ہی سی باتیں سوچتے رہیں گے، ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ساتھ ہمارے پسینے چھوٹیں گے اور ہم کانپتے رہیں گے۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس میں تبدیلی دکھائی دی۔ موت اس کے منہ پر لکھی ہوئی تھی۔ میری خودداری کو ٹھیس لگی۔ ٹام کے ساتھ میں چوبیس گھنٹے سے تھا۔ میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔ اس سے باتیں کی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ہم دونوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ لیکن اب ہم دونوں بالکل ایسے تھے جیسے جڑواں بھائی۔ محض اس وجہ سے کہ ہم دونوں کو ایک ساتھ مرنا تھا۔ ٹام نے میری طرف دیکھے بغیر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''پابلو، معلوم نہیں...... معلوم نہیں وجود بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے یا نہیں۔''

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ ''ابے سور۔ ذرا اپنے نیچے تو دیکھ۔''

اس کے دونوں پاؤں کے بیچ میں تالاب سا بنا ہوا تھا اور پاجامہ میں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔

بلجین قریب آیا اور بناوٹی توجہ سے پوچھنے لگا۔ ''کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟''

ٹام نے بدمزاجی سے کہا۔ ''میں نہیں جانتا یہ کیا ہے، مگر مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔"

بلجبین نے اپنی کاپی میں کچھ لکھ لیا۔ ہم اسے دیکھتے رہے۔ کمسن جوان بھی اُسے دیکھتا رہا۔ ہم تینوں اس کی طرف اس لیے دیکھ رہے تھے کہ وہ زندہ تھا۔ اس کی حرکات وسکنات سب زندہ آدمیوں کی سی تھیں۔ تفکرات زندہ آدمیوں جیسے تھے۔ اس تہہ خانے میں وہ اسی طرح کانپ رہا تھا، جس طرح زندہ دل کو کانپنا چاہیے۔ اس کا جسم خوب بنا ہوا اور پوری طرح اس کے اختیار میں تھا۔ ہم تینوں —ہمیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا۔ یا کم از کم اس حد تک، جس حد تک بلجبین کو تھا۔ میں نے بھی اپنے پاجامے کو ٹٹولنا چاہا تھا مگر میری ہمت نہ پڑی۔ میں نے بلجبین کو اپنی ٹانگیں جھکاتے دیکھا۔ اپنے رگ پٹھوں پر اسے کامل اختیار تھا اور وہ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ کل کیا ہوگا۔ ہم تینوں، بے خون کے بھوت اسے تک رہے تھے اور خفاشوں کی طرح اس کا خون چوس رہے تھے۔

بلجبین نے اس سلسلے کو یوں توڑا کہ کمسن جوان کے قریب گیا۔ کیا کسی طبی وجہ سے وہ جوان کی گردن چھو رہا تھا یا یہ کوئی ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا تھا؟ اگر یہ مہربانی تھی تو ساری رات میں پہلی مرتبہ ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ نے جوان کے سر اور گلے کو چھوا۔ جوان اسے ویسے ہی گھورے گیا اور کچھ نہ بولا۔ پھر ایک دم سے اس نے بلجبین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ان سفید سوکھے ہوئے پنجوں میں ایک موٹے چربیلے ہاتھ کا ہونا ایسی کوئی دلچسپ چیز نہیں تھی۔ میں منتظر رہا کہ دیکھئے اب اور کیا ہوتا ہے اور ٹام بھی یہی سوچ رہا ہوگا لیکن بلجبین اس کا کوئی مطلب نہیں نکال سکا۔ وہ مشفقانہ انداز سے مسکراتا رہا۔

ذرا سی دیر بعد جوان نے اس موٹے چربیلے ہاتھ کو اپنے منہ کی طرف کھینچا اور اسے کاٹنا چاہا۔ بلجبین نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ کر چھڑا لیا اور الٹے پیروں پیچھے ہٹ کر پھر دیوار سے جا لگا۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے ہم سب کی طرف خوف سے دیکھا۔ اسے یکا یک خیال آیا ہوگا کہ ہم اس کی طرح کے آدمی نہیں ہیں۔ میں نے ہنسنا شروع کیا اور ایک محافظ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا اس طرح سو رہا تھا کہ آنکھیں کھلی تھیں اور سفید

سفید دیدے دکھائی دے رہے تھے۔

میں ایک ہی وقت میں تھکا ہوا بھی تھا اور گھبرایا ہوا بھی۔ صبح کیا ہونے والا ہے یا مرنے کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں نکل سکتا تھا۔ ذہن میں الفاظ ہی الفاظ یا خلا ہی خلا آئے گا۔ کسی اور بات پر خیال جماتا تو مجھے بندوق کی نالیں یا رائفلیں اپنی طرف لگی ہوئی دکھائی دیتیں۔ بیسیوں ہی دفعہ میں نے اپنے آپ کو مرتے دیکھا اور ایک دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ واقعی مجھے مار دیا گیا ہے۔ شاید میری آنکھ لگ گئی ہوگی۔ وہ مجھے دیوار کی جانب گھسیٹ کر لے جا رہے تھے اور میں ان سے کشمکش کر رہا تھا۔ میں ان سے معافی مانگ رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور میں نے بلجین کی طرف دیکھا، کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ میں سوتے میں چیخنے لگا ہوں۔ مگر وہ کھڑا اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ اس نے کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی تھی۔ اگر میں چاہتا تو شاید تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا۔ میں اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ میرا پلیتھن نکل چکا تھا۔ زندگی کے دو گھنٹے کیوں ضائع کیے جائیں۔ صبح جب وہ مجھے آ کر جگائیں گے تو نیند کے خمار میں مجھے ان کے پیچھے پیچھے گھسٹنا پڑے گا اور میں چوں کیے بغیر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ کسی بے زبان جانور کی طرح میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے خوف تھا کہ سوتے میں کابوس کے دورے نہ پڑ جائیں۔ میں نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ دماغ کے خلا کو بھرنے کے لیے میں نے اپنی ساری زندگی کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ پچھلی باتیں جوق در جوق اُبل پڑیں۔ اچھی بھی اور بری بھی۔ یا شاید آج پہلی دفعہ اچھے برے کی تخصیص پیدا ہوئی تھی۔ چہرے ہی چہرے یا کہانیاں ہی کہانیاں۔ ایک نئے بھرتی ہوئے نوجوان کا چہرہ دوبارہ دیکھا۔ یہ ویلنشیا میں مارا گیا تھا۔ ماموں کا چہرہ دیکھا۔ رامن گراس کا چہرہ۔ اور پھر کہانیاں یاد آ گئیں۔ ۱۹۲۶ء میں کس طرح بے کار پھرتا رہا۔ کس قدر قریب تھا کہ میں بھوک سے مر جاؤں۔ وہ رات یاد آئی جو میں نے غرناطہ کے ساحل پر گزاری تھی۔ میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا اور مجھے سخت طیش آ رہا تھا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس پر مجھے ہنسی آئی۔ کتنی شدت سے میں مسرتوں، عورتوں اور آزادی کے پیچھے دوڑتا تھا! کیوں؟ میں ہسپانیہ کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں انقلابیوں کی جماعت میں شریک ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ میں نے اس سب کچھ کو دین وایمان سمجھ رکھا تھا اور اپنے کو سمجھ لیا تھا کہ غیر فانی ہوں۔

اس لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ساری زندگی میرے سامنے آگئی ہے اور میں نے دل میں کہا۔ ''یہ سب جھوٹ ہے۔'' اس کی قدر و قیمت ہی کیا ہے۔ یہ تو ختم ہوگئی۔ تعجب ہوتا تھا کہ میں کیسے آوارہ پھرتا تھا اور لڑکیوں سے کیسے مذاق کرتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس طرح مروں گا تو اٹھ کر پلکی بھی نہ پھوڑتا۔ میری زندگی میرے سامنے تھی، ختم شدہ— جیسے تھیلے میں بند ہو۔ لیکن اس کے اندر کی ہر چیز نا تمام تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں نے اسے جانچنا چاہا۔ میں کہنا چاہتا تھا ''آہا! کیسی حسین زندگی ہے!'' مگر اسے جانچا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ تو صرف ایک ہیولی تھا۔ ابدیت کی شاہراہ پر اپنے نشانِ راہ بنانے ہی میں میں نے اپنی ساری زندگی صرف کردی تھی اور خاک بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا— مجھے کسی بات کا افسوس نہیں تھا— بے شمار چیزیں تھیں جن کا افسوس کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً شراب نوشی میں میرا منزا نیلا پینے کا ذوق یا قرطبہ کے قریب ایک چھوٹی سی کھاڑی میں نہانا۔ مگر موت نے سب کو غارت کردیا تھا۔

بلجیئن کے دماغ میں ایک دم سے ایک خوشگوار تجویز آئی اور وہ ہم سے کہنے لگا۔ ''میرے دوستو! میں یقین دلاتا ہوں۔ بشرطیکہ فوجی منتظمین اجازت دیں گے— کہ اگر تم اپنے کسی پیارے کو چٹھی لکھو تو میں اسے پہنچادوں گا۔''

ٹام نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میرا کوئی نہیں ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹام تھوڑی دیر منتظر رہا۔ پھر تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا کونشا کو کوئی پیغام نہیں بھیجو گے؟''

''نہیں۔''

مجھے اس اشارے پر نفرت ہونے لگی۔ یہ میرا قصور تھا۔ میں نے کل رات کو کونشا کا ذکر کیا تھا۔ مجھے کرنا نہیں چاہئے تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک سال تک رہا۔ ایک دن پہلے اگر پانچ منٹ بھی اس کے ساتھ گزارنے کی مجھے اجازت مل جاتی تو میں معاوضے میں اپنا ہاتھ تک کٹوا ڈالتا۔ یہی شدت تھی جس کی وجہ سے میں نے اس کا تذکرہ کر دیا۔ میں بے قابو ہو گیا تھا۔ لیکن اب تو میں اسے دیکھنا تک گوارا نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ اس سے مجھے کچھ نہیں کہنا تھا۔ میں اسے اپنی آغوش تک میں لینے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنے جسم سے خوف لگ رہا تھا۔ کیوں کہ وہ سفید پڑ گیا تھا اور پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر شاید اس سے بھی ایسی ہی نفرت ہو جاتی جیسی کہ اپنے آپ سے۔ کونشا جب میری موت کی خبر سنے گی تو روئے گی۔ مہینوں اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دے گی، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ مرنا تو مجھے ہے۔ مجھے اس کی حسین ملائم آنکھوں کا خیال آیا۔ جب وہ میری طرف دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی چیز اس میں سے نکل کر مجھ میں آ گئی ہے۔ مگر اب تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اگر وہ مجھے اب دیکھے تو اس کی نظر بھی اس کی آنکھوں ہی میں رہ جائے گی۔ مجھ تک نہیں پہنچے گی۔ میں اکیلا تھا۔

ٹام بھی اکیلا تھا، مگر اس طرح کا اکیلا نہیں۔ وہ بنچ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے بنچ کو مسکرا کر دیکھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بنچ کو بڑی احتیاط سے چھوا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کانپنے لگا۔ اگر میں ٹام ہوتا تو بنچ کو اس طرح چھونا مجھے پسند نہ آتا۔ یہ تو گھٹیا تماشے کی سی بات ہوئی۔ ہاں یہ میں نے بھی محسوس کیا کہ تمام چیزیں پرانی دکھائی دے رہی تھیں۔ دھندلی اور کچھ گھلی ہوئی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ بنچ، لیمپ، کوئلے کی خاک کے ڈھیر کو دیکھوں اور محسوس کروں کہ میں مرنے والا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں موت کے بارے میں واضح طور پر نہیں سوچ سکتا تھا لیکن میں اسے ہر جگہ دیکھ سکتا تھا۔ چیزوں میں، چیزوں کی بتدریج ہیئت میں، اجتناب، جیسے کسی مرنے والے کی بالیں پر چپکے چپکے باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ اس کی اپنی موت تھی جسے ٹام نے بنچ پر چھوا تھا۔

میں جس حالت میں اب تھا اگر کوئی مجھ سے آ کر یہ کہتا کہ میری جاں بخشی ہوگئی ہے اور میں اپنے گھر جا سکتا ہوں تب بھی میں ایسا ہی سرد رہتا۔ کئی گھنٹے انتظار کرنا یا کئی سال انتظار کرنا— بات ایک ہی ہے۔ جب یہ فریب زائل ہو جائے کہ ہم کبھی نہیں مریں گے۔ ایک طرح سے تو مجھے کسی بات کی پروانہیں رہی تھی۔ مجھے سکون تھا مگر کس قیامت کا سکون! جسمانی طور پر ان آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، ان کانوں سے سن رہا تھا۔ مگر میں، میں نہیں تھا۔ پسینے از خود چھوٹ رہے تھے اور کپکپی تھی کہ خود بخود لگ رہی تھی۔ میں اپنے جسم کو اب خود بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ مجھے اسے دیکھنا پڑتا تھا، یہ جاننے کے لیے کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ میرا جسم ایسا ہوگیا تھا جیسے کسی اور کا جسم ہو۔ بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بوجھ ہے۔ جو مجھے دبا رہا ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ مجھے بڑے کپڑے سے باندھ دیا گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے پاجامے کو چھوا، وہ گیلا تھا۔ نہیں نہیں یہ پسینے سے گیلا ہوا تھا یا پیشاب سے؟ احتیاطاً میں نے جا کر کوئلے کی خاک کے ڈھیر پر پیشاب کیا۔

بلجین نے اپنی گھڑی نکال کر دیکھی اور بولا۔ ''ساڑھے تین بجے ہیں۔''

بدمعاش کہیں کا۔ جان کر اس نے وقت بتایا تھا۔ ٹام اچھل پڑا۔ اب تک ہم نے سوچا نہیں تھا کہ وقت گزرا جا رہا ہے۔ کالی رات نے ہم کو گھیر رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ رات کب اور کیسے شروع ہوئی تھی۔

کمسن جوان نے رونا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھ مل مل کر اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔'' وہ ہاتھ اٹھائے ادھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ پھر ایک چٹائی پر گر پڑا اور روتا رہا۔

ٹام نے اسے دیکھ کر افسوس کیا۔ وہ جوان کی تسلی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بات بھی یہی تھی کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ ہم سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔ مگر وہ ہم سے کم متاثر تھا۔ وہ اس مریض کی طرح تھا جو اپنی بیماری کا مقابلہ بخار سے کرتا ہے۔ جب بخار نہیں ہوتا تو اس کی حالت زیادہ مخدوش ہوتی ہے۔

وہ روتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا۔ اسے موت کا خیال نہیں ستا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے اوپر ترس کھا کر رونا چاہتا تھا۔ مگر ہوا اس کا الٹا۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ میں نے اس کے دبلے، جھکولے کھاتے کندھے دیکھے اور میری انسانیت ختم ہوگئی۔ اب نہ تو مجھے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا اور نہ ہی دُوسروں پر۔ میں نے دل میں کہا۔ ''میں کم ہمتوں کی طرح نہیں مروں گا۔''

ٹام اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گول روشن دان کے عین نیچے جا کھڑا ہوا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے ضد سوار تھی مجھے مردانہ وار مرنا تھا اور اس کا خیال تھا۔ اس سب پر چونکہ ڈاکٹر نے وقت بتا دیا تھا۔ اس لیے لمحے پھسلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے قطرہ قطرہ ہو کر پانی بہہ رہا ہو۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ ٹام کی آواز سنائی دی۔ ''اُن کی آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں۔''

احاطے میں لوگ چل پھر رہے تھے۔ ''کم بخت کر کیا رہے ہیں؟ اندھیرے میں تو گولی نہیں چلا سکتے۔''

کچھ دیر بعد خاموشی ہوگئی۔ میں نے ٹام سے پوچھا۔ ''پو پھٹ رہی ہے۔''

پیڈرو نے اٹھ کر لیمپ بجھا دیا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ ''میں تو مر گیا سردی سے۔''

تہہ خانے میں مدھم روشنی ہوگئی تھی۔ دور سے ہمیں دھاکوں کی آواز آ رہی تھی۔

میں نے ٹام سے کہا۔ ''کام شروع ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے پیچھے احاطے میں ہیں۔''

ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ مانگا۔ مجھے سگریٹ یا شراب کی ضرورت نہیں تھی۔ اب بس باڑ پر باڑ چلتی رہے گی۔

ٹام نے کہا۔ ''تم سمجھے؟'' وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر چپکا ہو رہا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا اور ایک لفٹنٹ اور چار سپاہی اندر آئے۔ ٹام کا سگریٹ گر پڑا۔

”اسٹین ہاک؟“

ٹام نے جواب نہیں دیا۔ پیڈرو نے ٹام کی طرف اشارہ کیا۔

”جوان میربل؟“

”وہ ہے چٹائی پر۔“

لفٹنٹ نے کہا۔ ”اُٹھو۔“ جوان ہلا تک نہیں۔ دو فوجیوں نے اس کے کندھے پکڑ کر کھڑا کیا مگر ان کے چھوڑتے ہی وہ پھر چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔

سپاہی سوچ میں پڑ گئے۔

لفٹنٹ نے کہا۔ ”یہ کوئی پہلا آدمی نہیں ہے جس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ تم دونوں اسے اٹھا لو۔ وہ سب کام وہاں ٹھیک کر لیں گے۔“

ٹام کی طرف پلٹ کر بولا۔ ”چلو، ادھر آؤ۔“

ٹام دو سپاہیوں کے بیچ میں ہو کر چل پڑا۔ دو سپاہی ان کے پیچھے پیچھے لڑکے کو اٹھائے روانہ ہوئے۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ جب میں بھی باہر نکلنے کو ہوا تو لفٹنٹ نے مجھے روک دیا۔

”تم ابی اٹا ہو۔“

”ہاں۔“

”تم یہیں ٹھہرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ تمہیں بلوائیں گے۔“

وہ سب باہر نکل گئے۔ بلجین اور دونوں پہرے دار بھی چلے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے نہیں معلوم میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جو کچھ بھی ہونا ہے جلدی ہو جائے۔ باڑ مارنے کی آواز مقررہ وقفوں سے آ رہی تھی۔ ہر آواز پر میں لرزنے لگتا۔ میں چیخنا اور اپنے بال کھسوٹنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹھونس لیے۔ کیوں کہ میں ڈھنگ سے مرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ آئے اور ایک چھوٹے کمرے میں مجھے لے گئے۔ کمرے میں سگار کی بُو بسی ہوئی تھی اور اس میں گرمی نا قابلِ برداشت تھی۔ یہاں دو افسر

بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ کاغذات ان کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔

''کیا تمہارا نام ابی ایٹا ہے۔''

''جی ہاں۔''

''رامن گرس کہاں ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

جو مجھ سے سوال کر رہا تھا پستہ قد اور موٹا تھا۔ عینک میں سے اس کی آنکھیں سخت دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''ادھر آؤ۔''

میں اس کے قریب گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرا بازو پکڑ کر کچھ اس طرح مجھے دیکھنے لگا کہ میں زمین میں دھنس جانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے میرے چٹکیاں لیں۔ یہ مجھے تکلیف دینے کے لیے نہیں کیا جا رہا تھا۔ بلکہ مجھ پر داؤں مارا جا رہا تھا— وہ مجھ پر چھا جانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اپنا گندہ سانس میرے منہ پر چھوڑے۔ ہم اسی طرح ایک لمحے کے لیے کھڑے رہے اور مجھے ہنسی آنی شروع ہوئی۔ بھلا ان باتوں کا اثر اس پر کیا ہوسکتا ہے جو مرنے کو کھڑا ہو۔ سب بیکار ثابت ہوا۔ اس نے مجھے زور سے دھکیل دیا اور پھر بیٹھ گیا۔ بولا۔ ''اُس کی جان پر تمہاری جان کی بازی لگی ہے۔ اگر تم ہمیں بتادو کہ وہ کہاں ہے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

یہ دونوں آدمی، سجے سجائے ہاتھوں میں ہنٹر، پیروں میں لمبے جوتے پہنے، یہ دونوں بھی مرنے والے تھے، گو اتنی جلدی نہیں جتنی جلدی کہ میں مرنے والا تھا۔ ان کا یہ کام تھا کہ فہرستوں میں نام چھانٹتے رہیں۔ لوگوں کو قید کرنے اور انہیں مروانے میں اپنا سارا وقت صرف کرتے رہیں۔ اسپین کے مستقبل کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی اور دوسرے معاملوں میں بھی ذاتی رائے چلاتے تھے۔ ان کی حرکتیں مضحکہ خیز اور نفرت انگیز تھیں۔ ان کا نقطۂ نظر مجھے تو جچتا نہ تھا اور وہ خاصے سڑی سودائی معلوم ہوتے تھے۔

موٹا آدمی مجھے گھورتا رہا اور اپنے جوتے پر ہنٹر بجاتا رہا۔ اس کی ہر حرکت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا خونخوار جانور ہے۔

''کیوں— سمجھ میں آیا؟''

"مجھے نہیں معلوم گرس کہاں ہے۔ وہ تو غالباً میڈرڈ میں ہے۔"

دُوسرے افسر نے بھدا سفید ہاتھ سستی سے اٹھایا۔ یہ سستی بھی بناوٹی تھی اور خودساختہ۔ میں ان کی ایک ایک بات کو تاڑ رہا تھا اور مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے بھی آدمی ہوں گے جوان کی حماقت آمیز باتوں میں آجاتے ہوں گے۔

اُس نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں سوچنے کے لیے پاؤ گھنٹہ دیا جاتا ہے۔ لے جاؤ اسے مال خانہ میں۔ پاؤ گھنٹے کے بعد واپس لانا۔ اگر پھر بھی یہ انکار ہی کرتا رہا تو ہم اسے فوراً گولی سے اڑا دیں گے۔"

انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے رات بھر انتظار کیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ٹام اور جوان کو باڑ مار رہے تھے تو ایک گھنٹہ اور میں نے تہہ خانے میں انتظار کیا تھا اور اب وہ مجھے مال خانے میں بند کر رہے تھے۔ یہ سب انہوں نے کل شام ہی طے کر لیا ہوگا۔ انہیں یقین ہوگا کہ بالآخر میرے اعصاب جواب دے جائیں گے اور پھر وہ مجھ سے سب کچھ اگلوا لیں گے۔

مگر وہ غلطی پر تھے۔ میں مال خانے میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کیوں کہ میں بہت کمزور ہو گیا تھا اور میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ مگر اُن کی تجویز پر نہیں۔ حقیقتاً مجھے معلوم تھا کہ گرس کہاں ہے۔ شہر سے چار کلو میٹر کے فاصلے پر وہ اپنے ایک رشتہ کے بھائی کے ہاں چھپا ہوا تھا۔ یہ بھی میں جانتا تھا کہ جب تک یہ مجھے اذیتیں نہیں پہنچائیں گے اس وقت تک میں بھید دینے کا نہیں (مگر معلوم نہیں ہوتا تھا کہ انہیں اذیت رسانی کا خیال ہی نہیں آیا) باقی سب کچھ میرا خوب سوچا سمجھا ہوا تھا اور مجھے اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔ ہاں میں اپنے اس طرز عمل کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ گرس کا پتہ دینے کے بجائے میں مرجانا چاہتا تھا۔ کیوں؟ رامن گرس کی مجھے واقعی اب کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ صبح ہونے سے ذرا پہلے اس کی دوستی میرے دل میں مرچکی تھی۔ اسی وقت کونشا کی محبت نے بھی دم توڑا تھا۔ اسی وقت میری زندہ رہنے کی آرزو بھی مٹ چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میں اس کی عزت اب بھی کرتا تھا۔ وہ مضبوط تھا۔ مگر یہ وجہ تو

ایسی نہیں تھی کہ میں اس کے بدلے مرنے کو تیار تھا۔ اس کی زندگی کی قیمت میری زندگی سے زیادہ نہیں تھی۔ کسی زندگی کی کچھ بھی قیمت نہیں تھی۔ دیوار سے ایک آدمی کو لگا کر وہ اس پر اتنی گولیاں چلانا چاہتے تھے کہ وہ مر جائے۔ چاہے میں ہوں یا گرس ہو، یا کوئی اور۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ اسپین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ مگر مجھے اسپین یا انقلاب کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میں گرس کا پتہ دے کر اپنی جان بچا سکتا تھا اور میں یہ ہرگز کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کچھ مسخرا پن بھی معلوم ہوتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ یہ میری ضد ہے اور کچھ نہیں۔ کیا میں اس قدر موٹی عقل کا ہو گیا ہوں؟

مجھ پر ایک عجیب طرح کی مسرت چھا گئی۔ وہ مجھے لینے آ گئے اور دونوں افسروں کے سامنے لے گئے۔ ایک چوہا ہمارے پیروں میں سے ہو کر بھاگا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے ایک محافظ کی طرف پلٹ کر کہا۔ ''دیکھا تم نے چوہا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑا بھیا نک بنا ہوا تھا اور شاید سنجیدگی کو ضرورت سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ میں ہنسنا چاہتا تھا مگر میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اس خوف سے کہ اگر ہنسنا شروع ہوا تو پھر ختم نہیں ہوگا۔ محافظ نے اپنی مونچھ کو مروڑی دی۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں اپنی مونچھیں کاٹ ڈالنی چاہئیں۔''

مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ زندہ بھی ہے اور اپنے چہرے پر بالوں کو اگنے بھی دیتا ہے۔ اس نے ایک ہلکی سی لات میرے رسید کی اور میں چپکا ہو گیا۔

افسر نے کہا۔ ''ہاں جی! تم نے سوچ لیا؟''

میں نے ان کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی عجیب و غریب کیڑے ہوں۔ میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے۔ وہ قبرستان کی کسی قبر میں ہوگا یا گورکن کی جھونپڑی میں چھپا ہوا ہوگا۔'' میں نے از راہ تمسخر یہ بات کہی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ گھبرا کر اٹھیں۔ اپنی پیٹیاں کسیں اور حکم احکام کا شور مچا دیں۔

''چلو موارز لیفٹنٹ تم چند آدمی لو۔ تم اگر سچ بولے تو میرا صرف ایک لفظ کہنا کافی

ہے اور اگر تم نے ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے تو تمہیں سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔"
وہ سب جلدی جلدی نکل گئے اور میں آرام سے ایک محافظ دستے کی نگرانی میں بیٹھا رہا۔ جب مجھے خیال آتا کہ وہ کیسی کیسی حماقتیں کریں گے تو اپنی مسکراہٹ کو روک نہیں سکتا تھا۔ میرا دماغ معطل ہو رہا تھا۔ مجھ میں گراوٹ آ رہی تھی اور ضد پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ وہ ڈھئی ہوئی قبر کھول رہے ہیں اور ایک ایک کر کے ان تہہ خانوں کے دروازے کھولتے پھر رہے ہیں جن میں تابوت رکھے جاتے ہیں۔ میں نے اس منظر کو اس طرح دیکھا جیسے میں کوئی اور ہوں۔ اس ڈرامے میں قیدی نے گویا تہیہ کر لیا تھا کہ ہیرو کا پارٹ ادا کرے گا۔ فوجی سپاہی بڑی بڑی مونچھیں لگائے اور افسر وردیاں پہنے قبروں میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ بڑا پُر لطف طربیہ تھا۔
آدھ گھنٹے کے بعد موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے گولی سے اڑانے کا حکم دینے واپس آیا ہے۔ باقی آدمی قبرستان میں ہوں گے۔
افسر نے میری طرف دیکھا۔ وہ بددل یا مایوس قطعی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
اس نے کہا۔ "اسے بڑے احاطے میں لے جاؤ، جہاں اور قیدی بھی ہیں۔ فوجی نقل و حرکت سے فارغ ہونے کے بعد کوئی مناسب منصف اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔"
میں سمجھا کہ میں نے ٹھیک نہیں سنا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تو کیا وہ مجھے ابھی گولی سے نہیں اڑا رہے؟"
"بہر حال ابھی تو نہیں۔"
یہ کہہ کر اس نے پھر میری طرف دیکھا۔
"میں اب بھی نہیں سمجھا۔ لیکن کیوں؟"
اس نے کندھے اُچکائے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سپاہی مجھے کھینچ کر لے گئے۔ بڑے احاطے میں قیدیوں کی خاصی تعداد تھی۔ عورتیں، بچے اور چند بڈھے۔ میں نے بیچ میں پھر پھر کر چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔
دوپہر کو انہوں نے ہمیں طعام خانے میں کچھ کھانا دیا۔ کئی کئی آدمیوں نے مجھ

Scanned by CamScanner

سے سوال کیے لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ان لوگوں کو جاننا چاہیے تھا، مگر مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام ہوتے ہوتے انہوں نے دس اور قیدی احاطے میں داخل کر دیے۔ میں نے گریشیا نابنائی کو پہچانا۔ وہ بولا۔ ''یا اللہ! تم زندہ ہو؟''

میں نے کہا۔ ''انہوں نے مجھے سزائے موت دی تھی اور پھر اپنی رائے بدل ڈالی۔ مجھے نہیں معلوم کیوں؟''

گریشیا نے کہا۔ ''انہوں نے مجھے دو بجے گرفتار کیا ہے۔''

''کیوں؟'' گریشیا کو سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

اس نے کہا۔ ''نہ جانے کیوں جو ذرا بھی ان کی طرح نہیں سوچتا اسے پکڑ لیتے ہیں۔'' پھر نیچی آواز میں بولا۔ ''انہوں نے گرس کو پکڑ لیا ہے۔''

میں نے کانپنا شروع کر دیا۔ ''کب؟''

''آج صبح۔ اس نے بڑا احمق پن کیا۔ منگل کو وہ اپنے رشتے کے بھائی کے ہاں سے چلا گیا، اس سے جھگڑا ہو گئی تھی اور بہت سے آدمی تھے جو اُسے چھپائے رکھتے، مگر وہ کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''اگر میں چھپتا تو ابی ایٹا کے مکان میں چھپتا۔ مگر وہ گرفتار ہو چکا ہے، اس لیے میں قبرستان میں جا کر چھپتا ہوں۔''

''قبرستان میں؟''

''ہاں، اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ وہ وہاں پہنچ گئے۔ آج صبح یہ تو ہونا ہی تھا۔ گورکن کی جھونپڑی میں جا کر انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے ان پر گولی بھی چلائی مگر انہوں نے دھر ہی لیا۔''

''قبرستان میں؟''

تمام چیزیں میرے سر میں گھومنے لگیں اور میں نے اپنے آپ کو زمین پر بیٹھا پایا۔ میں اس قدر ہنس رہا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے تھے۔

○○

نام کتاب : **دلی جو ایک شہر تھا**

ناشر و مرتّب : فیاض رفعت

پتہ : 328, ELDECO GREENS, Dream Villas,
Gomti Nagar, Lucknow- 226010 (U.P.)

تعداد : ۵۰۰

زیر اہتمام : تخلیق کار پبلشرز
۲۰۵/۶، جے۔ا۔ یکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود انتخش

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- راعی بک ڈپو، ۳۴۷، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔۲۱۱۰۰۲ (یو۔پی)
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔جے۔اسپتال، ممبئی۔۴۰۰۰۰۸
- ہورائزن ڈسٹری بیوٹرس، گوراچاند روڈ، انٹالی، کولکاتہ۔۷۰۰۰۱۴ (مغربی بنگال)

T.P.: 0215
ISBN-978-93-80182-30-8
2011
₹280.00
DILLI JO EK SHEHAR THA *(Articles)*
by SHAHID AHMED DEHELVI
Compiled by FAYYAZ RIFAT
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
205 / 6, J-Extension., Laxmi Nagar, Delhi - 110092
Ph.:011-22442572,9811612373 Email:qissey@rediffmail.com

شاہد احمد دہلوی
دلّی جو ایک شہر تھا
مرتب: فیاض رفعت